ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر آفتاب احمد

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے میرا غائبانہ تعارف میری طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر حمید احمد خاں کے واسطے ہوا جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں ان کے شاگرد رہے تھے اور ان کا ذکر نہایت عزت و احترام سے کیا کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب رہنے والے تو لاہور کے تھے مگر تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں عمر کا بیشتر حصہ انہوں نے لاہور سے باہر گزارا۔ علی گڑھ سے ایف اے کرنے کے بعد بی اے اور ایم اے فلسفہ کے لیے وہ سینٹ کالج دہلی چلے گے، پھر لاہور آئے اور لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس تو کرلیا مگر وکالت نہیں کی بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے۔ وہاں سے جرمنی گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

وطن واپسی پر عثمانیہ یونیورسٹی ہی میں فلسفہ کے پروفیسر اور پھر صدر شعبہ ہوئے۔ ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ انہیں ریاست جموں و کشمیر کے محکمہ تعلیم کے سربراہ کے عہدے کی پیشکش ہوئی تو گویا ان کی دلی مراد بر آئی۔ انہوں نے اس پیشکش کو بڑی خوشی سے قبول کیا۔ خطۂ کشمیر

سے ان کو عشق تھا۔ وہ حیدر آباد سے بھی ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خلیفہ صاحب کشمیری نژاد تھے اور اس پر انہیں بڑا ناز بھی تھا۔ لہٰذا کشمیر میں ملازمت اور مستقل قیام کی صورت پیدا ہوئی تو انہوں نے اسے مراجعت وطن کے مترادف سمجھا اور اس خیال سے کہ اب زندگی کے باقی دن وہیں بسر کریں گے، سری نگر میں ایک پُر فضا مقام پر گھر بھی بنالیا مگر تین چار سال بعد حالات نے جو کروٹ لی اس کی وجہ سے انہیں ملازمت اور اور جما جمایا گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ اپنے گھر کا کہ جسے انہوں نے بڑے شوق اور اہتمام سے بنوایا تھا ذکر تو اکثر کیا کرتے تھے مگر ان میں چونکہ راضی برضا رہنے کی صلاحیت بھی تھی لہٰذا انہوں اس انتہائی ناخوش گوار نقل مکانی کو بھی زندگی کی ایک حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا اور اسے اپنے دِل کا روگ نہیں بنایا۔ یوں بھی ان کی طبیعت میں کچھ ایسی رجائیت پسندی تھی کہ وہ چیزوں کے تاریک پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ان کے روشن پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی میں اُن کامیابیوں کو جو پاکستان بننے کے بعد ان کے حصے میں آئیں کشمیر سے واپسی پر محمول کیا کرتے تھے۔

پاکستان میں وہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے پہلے سربراہ مقرر کیے گئے بلکہ یہ ادارہ پاکستان کی پہلی مرکزی حکومت کے زمانے میں جس کے وزیر خزانہ غلام محمد صاحب خلیفہ صاحب کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے خلیفہ صاحب ہی کی تحریک پر لاہور میں قائم کیا گیا تھا۔ اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے خلیفہ صاحب نے اس کے لیے مال روڈ کے ایک حسین گوشے کلب روڈ پر سبزہ و گل کے تختوں کے درمیان ایک کوٹھی حاصل کی اور پھر وہ تصنیف و تالیف کے اس کام میں ہمہ تن مصروف ہوگئے جو اُن کے علمی و فکری کارناموں کی قیمتی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر چھوڑنے کا غم ان کا بھول گیا کہ یہی دور اُن کی اپنی دانست میں بھی تخلیقی لحاظ سے ان کی زندگی کا بہترین دَور تھا۔

خلیفہ صاحب سے میرا رسمی تعارف تو ۴۸۔۱۹۴۹ء کے موسم سرما میں ہوا تھا کہ جب پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے اور میں وہاں شعبۂ انگریزی

میں لیکچرار تھا۔ ایک دن بخاری صاحب سٹاف روم میں آئے اور باتوں باتوں میں یہ بتانے کے بعد کہ آج خلیفہ عبدالحکیم صاحب ان سے ملنے آرہے ہیں انہوں نے ایسے غیر معمولی الفاظ میں ان کا ذکر کیا جو بخاری صاحب کی زبان سے کسی کے بارے میں کم ہی سنے گئے تھے۔ ان کا انگریزی کا یہ جملہ مجھے اب تک یاد ہے:

"He Has a very incisive mind."

اور پھر فلسفہ، تصوف اور دیگر متعلقہ علوم میں ان کی دسترس اور رومی و اقبال کے فکر کو سمجھنے میں ان کے فہم و فراست کی تعریف کرتے رہے۔ بخاری صاحب کی گفتگو جاری تھی کہ خلیفہ صاحب خود ہی بخاری صاحب کے سیکرٹری کے ساتھ سٹاف روم کی طرف آنکلے۔ بخاری صاحب نے ان کا استقبال کیا، اسٹاف روم میں موجود اساتذہ سے ان کا تعارف کرایا اور پھر ان کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ خلیفہ صاحب کے بارے میں میرا پہلا تاثر اُن کے سرخ و سفید رنگ، ان کے چہرے کی بشاشت اور ان کی شخصی وجاہت کا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد خلیفہ صاحب تاثیر صاحب سے ملنے ان کے گھر آئے تو میں اتفاق سے وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس دن میں نے ان کی گفتگو بھی سنی جس میں لطیفے، اشعار، حالات حاضرہ پر تبصرہ، ہلکی پھلکی گپ شپ، سبھی کچھ شامل تھا۔ خلیفہ صاحب بڑے کھلے ڈھلے انداز میں باتیں کررہے تھے۔ کچھ دیر بیٹھے اور پھر جب جانے کو اُٹھے تو تاثیر صاحب انہیں رخصت کرنے باہر تک گئے۔ جونہی واپس آئے تو میں نے دیکھا کہ تاثیر صاحب کی طبعی شرارت جو دبائے نہیں دبتی تھی ان کے چہرے پر کھیل رہی ہے۔ کہنے لگے کہ اصل میں تو خلیفہ صاحب بخاری کے یار ہیں۔ اگرچہ بخاری ان سے عمر میں کچھ چھوٹے ہیں اور ہم بخاری سے چھوٹے۔ مگر تمہیں معلوم ہے کہ خلیفہ صاحب اپنے آپ کو اقبال سے کم تر نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں اقبال بھی کشمیری تھے۔ یہ بھی کشمیری ہیں۔ اقبال نے جرمنی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ انہوں نے جرمنی ہی سے وہی ڈگری حاصل کی ہے۔ اقبال رومی کے عاشق تھے۔ یہ بھی ہیں اور انہوں نے تو رومی پر کتاب بھی لکھی ہے۔ اقبال فلسفی اور شاعر تھے۔ یہ بھی

ہیں۔غرض یہ کسی بات میں اقبال سے گھٹ کے نہیں ہیں۔بس یہ ہے کہ اقبال کی بات ذرا چل نکلی ہے!.....تاثیر صاحب نے یہ بات جس انداز سے کہی تھی میں اس سے کچھ محظوظ ہوا اور ظاہر ہے کہ وہ خود بھی۔مگر اسے تاثیر صاحب کی شوخ گفتاری کا نمونہ ہی سمجھنا چاہیے ورنہ خلیفہ صاحب کی قابلیت کے وہ بھی قائل تھے۔حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے دورِ جدید میں اسلامی فلسفہ اور ثقافت کو سمجھنے پرکھنے اور اُن کی قدر و قیمت اُجاگر کرنے کے جس کام کی ابتدا کی تھی خلیفہ صاحب نے اس کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے آگے بڑھایا ہے اور اس سلسلے میں ان کی جملہ تصنیفات، جن میں میٹافزکس آف رومی اور اس کا اردو ترجمہ الٰہیات رومی، تشبیہات رومی، حکمت رومی، اسلامک آئیڈیولوجی اور اس کا اردو ترجمہ اسلام کا نظریۂ حیات، افکارِ غالب اور فکرِ اقبال شامل ہیں، اپنی اپنی جگہ ایک روشن سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ باقی رہی شاعری تو مشرق میں پڑھے لکھے لوگوں کے طبقے میں شعر تو سبھی کہہ لیتے ہیں ہاں اقبال جیسے عظیم شاعر البتہ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اس ملاقات کے بعد بھی خلیفہ صاحب سے بعض محفلوں میں سرسری ملاقاتیں ہوتی رہیں مگر میرے ذاتی تعلقات کا سلسلہ اس وقت استوار ہوا جب جنوری ۱۹۵۳ء میں مجید ملک صاحب اور ان کی بیگم آمنہ باجی لاہور آئے۔ مجید صاحب تو ہفتہ دس دِن ٹھہر کر واپس کراچی چلے گئے مگر آمنہ باجی نے بچوں سمیت لاہور میں دو چار مہینے گزارے۔ وہ مجید صاحب کے بڑے بھائی حمید ملک صاحب کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ خلیفہ صاحب آمنہ باجی کے حقیقی ماموں تھے اور مجید ملک صاحب اور حمید ملک صاحب کے پرانے دوست۔ یہ سب لوگ اکثر خلیفہ صاحب سے ملنے ان کے گھر جاتے تھے، کئی بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ آمنہ باجی کی کراچی واپسی کے بعد بھی حمید ملک صاحب اور میں خلیفہ صاحب کے ہاں جانے لگے اور ایک زمانے میں تو یہ دستور بن گیا کہ ہم دونوں رات کے کھانے کے بعد اکثر خلیفہ صاحب کے ہاں کشمیری گھرانوں کی مشہور معروف نمکین پیازی چائے پینے جایا کرتے تھے۔اس مضمون کی ابتدا میں ان کی زندگی کے بارے میں جو تفصیلات لکھی گئی ہیں وہ اسی زمانے میں دوران

گفتگو جستہ جستہ خود ان کی زبانی مجھے معلوم ہوئیں۔ خلیفہ صاحب کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ اس میں بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی کے علاوہ علمی و ادبی نکتے، رومی و حافظ اور غالب و اقبال کے اشعار پر ان کے تبصرے بھی شامل ہوتے تھے۔ اب میری ملاقات ان سے اتنی بڑھ چکی تھی کہ میں ان کی اپنی خواہش کے مطابق آمنہ باجی کے تتبع میں خلیفہ صاحب کی بجائے حکیم ماموں کہنے لگا تھا۔ اگلے چھ سال کے عرصے میں یعنی ان کی وفات تک وہ میرے لیے حکیم ماموں ہی رہے اور ان کی شفقت برابر مجھے حاصل رہی اور کچھ تکلف کے پردے بھی اُٹھ گئے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ خلیفہ صاحب کشمیری نژاد تھے اور اس پر انہیں بڑا ناز بھی تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بھی اپنے کشمیری ہونے کا فیضان سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ ذرا ترنگ میں آکر کہنے لگے کہ دیکھو لیڈروں میں جواہر لال نہرو، شاعروں میں اقبال، وکیلوں میں سر تیج بہادر سپرو، پہلوانوں میں رستم زماں گاماں سب کے سب کشمیری ہیں۔ میں نے ذرا شرارت آمیز لہجے میں گرہ لگائی کہ یہ سب حضرات کشمیری ہیں تو کیا وہاں کی زبان تک تو جانتے نہیں تھے۔ ان کی ذہنی نشوونما اور تربیت تو یوپی اور پنجاب کی سرزمینوں میں ہوئی تھی اور یہیں کی آب و ہوا اور علمی و ثقافتی فضا میں ان کا جوہر چمکا تھا۔ اس پر خلیفہ صاحب نے اپنے خاص انداز میں نسلی خصوصیات کے اثرات کا قصہ چھیڑ دیا اور ایران توران کی حکایات سنانے لگے۔ میں نے جواب میں ان کو یاد دلایا کہ آپ اپنی تقریروں میں تو اسلامی ثقافتی اقدار کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں:

اسلام امتیازِ نسب کا حریف ہے
کل آریہ تھے آج ملے سامیوں میں ہم

اس پر یہ بحث شروع ہوگئی کہ کشمیری آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا سامی نسل سے۔ اس کے بارے میں مورخین میں دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ بہرحال خلیفہ صاحب اہلِ کشمیر کی حد تک دماغ سے نہیں تو دل سے رنگ و نسل کے امتیاز کے قائل تھے اور اس کے بھی

کہ انسانی معاملات میں رنگ و نسل کے اشتراک و عدم اشتراک کا بڑا عمل دخل ہے۔

اس سلسلے میں وہ علامہ اقبال سے منسوب یہ واقعہ بھی سنایا کرتے تھے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد جب پنجاب اسمبلی کے سپیکر کے انتخاب کا وقت آیا تو اس میں دو حریف تھے۔ سر سکندر کی یونینسٹ پارٹی کی طرف سے سر شہاب الدین اور کانگریس پارٹی کی طرف سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سر شہاب الدین پنجاب کی جاٹ برادری سے تعلق رکھتے تھے اور کچلو امرتسر کی کشمیری برادری سے۔ سر شہاب الدین اگرچہ علامہ اقبال کے بہت پرانے اور بے تکلف دوست تھے مگر انہوں نے اس انتخاب میں اپنا اثر و رسوخ کچلو کی حمایت میں استعمال کیا حالانکہ وہ کانگریس کے امیدوار تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ صاحب کی ایک عزیزہ باجی رشیدہ لطیف کو جو لاہور سے خواتین کی طرف سے اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں تھیں خلیفہ صاحب کے چھوٹے بھائی خلیفہ عبدالغنی کی معرفت یہ پیغام بھجوایا کہ وہ اپنا ووٹ اپنے کشمیری بھائی کچلو کے حق میں دیں۔ میں نے یہ قصہ سن کر کہا کہ اقبال نے باجی رشیدہ لطیف کا ووٹ لینے کی خاطر لفظ تو یہی استعمال کیے ہوں گے مگر شاید انہیں ایک انگریز نواز پارٹی کے مقابلے میں ایک حریت پسند پارٹی کے امیدوار کی خصوصاً جب وہ کچلو جیسا مرد مجاہد ہو حمایت مقصود ہوگی۔ آپ اس واقعے کی تفسیر اس طرح کیوں نہیں کرتے؟

اس پر خلیفہ صاحب نے اقبال کی کشمیر نوازی کے سلسلے میں ایک ایسا حتمی حوالہ دیا جو میرے لیے ایک انکشاف سے کم نہ تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھے۔ الماری سے اقبال کی کتاب ''جاوید نامہ'' نکالی اور اس میں سے غنی کاشمیری کے باب میں ذیل کے اشعار سنائے:

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد؟
صید را سودائے صیادی کہ داد؟
آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر زروئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش

از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصلِ شاں از خاکِ دامن گیرِ ماست
مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست

شعر سنانے کے بعد کہنے لگے تمہیں معلوم ہے کہ یہ برہمن زادگان زندہ دل کون تھے؟ موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو۔ میں نے کہا کہ اس سے تو میرے موقف ہی کی تائید ہوتی ہے کہ اقبال حریت پسندوں کے طرف دار تھے۔ خلیفہ صاحب نے یہ کہہ کے مجھے لا جواب کر دیا کہ ذوقِ آزادی دینے والے تو کئی اور بھی تھے، اقبال نے صرف ان دو کشمیری برہمنوں ہی کی طرف کیوں اشارہ کیا؟

میں نے جب یہ واقعہ ۱۹۵۵ء میں اپنے قیامِ لندن کے دوران عاشق حسین بٹالوی صاحب کو سنایا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں تو ان اشعار کا علم خود پنڈت جواہر لال نہرو کے ذریعے ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ ایک دفعہ جب نہرو لندن آئے تو انہوں نے انڈیا ہاؤس کے ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے اپنے کیمبرج کے ایام کو یاد کیا اور پھر ایسے سربرآوردہ ہندوستانیوں کے ذکر میں کہ جنہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی اقبال کا نام لیا اور یہ کہا کہ وہ بہت بڑے شاعر تھے اور بعد میں انہوں نے مجھے اور میرے والد کو اپنی ایک نظم کے ذریعے زندہ جاوید کر دیا۔ عاشق صاحب نے کہا کہ تقریر کے بعد چائے کے دوران میں نے پنڈت جی سے پوچھا کہ اقبال کی وہ نظم کون سی ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ ''جاوید نامہ'' میں غنی کاشمیری والا باب دیکھیے۔ عاشق صاحب نے جب اس میں اشعار دیکھے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

کشمیر میں خلیفہ صاحب کے آباد ہونے اور پھر وہاں سے نکلنے کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس سے ایک دلچسپ داستان بھی وابستہ ہے جسے وہ بڑے مزے لے کر سنایا کرتے تھے۔ شاعروں میں خلیفہ صاحب رومی کے مرید تھے اور حافظ کے گرویدہ۔ دیوانِ حافظ سے فال نکالنا بھی ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر موقعوں پر حافظ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق ۱۹۴۳ء میں جب کشمیر جانے کا امکان پیدا ہوا تو شیراز کے

لسان الغیب کی طرف سے جو آواز آئی اس نے خلیفہ صاحب کے لیے فیصلے کا راستہ صاف کر دیا:

مسند بباغ بر کہ بخدمت چو بندگان
استادہ است سرو و کمر بستہ است نے

اور جب وہ وہاں سے واپسی کے بارے میں سوچنے لگے تو لسان الغیب نے آنے والے زمانے کی دہشت سے خبردار کرتے ہوئے نکل بھاگنے کا مشورہ دیا:

آتش رزق و ریا خرمنِ دیں خواہد سوخت
حافظ ایں خرقۂ پشمینہ بر انداز و برو

خلیفہ صاحب روشن خیال اور وسیع المشرب آدمی تھے۔ اسلامی فلسفہ و تصوف کے ماہر تھے مگر اس کے ساتھ مغربی فلسفہ اور ثقافت کا گہرا اثر بھی قبول کیے ہوئے تھے۔ آزادیٔ نسواں کے حامی تھے اور ان کے خاندان اور قریبی عزیزوں کی خواتین سب پڑھی لکھی تھیں اور پردے کی رسم سے آزاد۔ یوں تو خلیفہ صاحب اقبال کے بہت قائل تھے لیکن آزادیٔ نسواں، پردہ اور اسی قسم کے چند اور معاملات میں وہ اقبال کے خیالات سے متفق نہیں تھے اور اس کا برملا اظہار ہی نہیں بلکہ اس کے بارے میں فقرہ بازی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے خود ہی ذکر کیا کہ مری کے مال روڈ پر انہیں اقبال کی بیٹی منیرہ اور ان کے ساتھ یا الگ سے اکبر الٰہ آبادی کے خاندان کی کوئی خاتون سیر کرتے ہوئے نظر آئیں۔ انہوں نے خلیفہ صاحب کو آداب سلام کیا تو خلیفہ صاحب نے بغیر کسی رو رعایت کے انہیں اکبر کے مشہور اشعار سنا دیے:

بے پردہ آج آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کے پردے کو کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مجھے چونکہ خلیفہ صاحب کے ان خیالات کا علم تھا لہٰذا جب انہوں نے مجھ سے اپنے مقالے ''اقبال اور ملا'' کے بارے میں پوچھا جو پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ایک خصوصی جلسے میں پڑھا گیا تھا جہاں میں بھی موجود تھا تو میں نے کہا کہ مقالہ تو آپ کا بہت اچھا تھا لیکن ایک اور مقالے کا امکان ابھی باقی ہے اور وہ بھی صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ کہنے لگے وہ کون سا؟ میں نے کہا ''دی ملا اِن اقبال'' یہ سن کر خلیفہ صاحب محظوظ ہوئے، ہنس دیے اور بات ہنسی ہنسی میں ٹال دی۔

میری ان ملاقاتوں کے دوران خلیفہ صاحب کی بیگم اور ان کی بیٹی رفیعہ اور خاندان کے دوسرے افراد سے بھی میرے اور میری دونوں چھوٹی بہنوں جمیلہ اور رشیدہ کے بھی جو میرے ساتھ رہتی تھیں میل جول کے مراسم پیدا ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب جمیلہ کی شادی کا موقع آیا تو میں نے سوچا کہ بجائے کسی ملائے مسجد کو بلانے کے کیوں نہ خلیفہ صاحب سے نکاح پڑھانے کی درخواست کی جائے۔ خلیفہ صاحب ہم لوگوں سے بڑی شفقت کرتے تھے لہٰذا فوراً مان گئے۔ نکاح کے ساتھ ہی شام کے کھانے کا انتظام بھی تھا۔ ہم لوگ اس زمانے میں میسن روڈ پر تاثیر صاحب کے مکان کے اوپر کے حصے میں رہتے تھے۔ چنانچہ نکاح کی رسم تاثیر صاحب کے ڈرائنگ روم میں ادا ہوئی۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ اس شام اتفاق سے بارش بھی ہوگئی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ خلیفہ صاحب نے نکاح کا خطبہ شروع کیا تو سب سے پہلے انہوں نے دولہا میاں کو مخاطب کر کے یہ مزے کی بات کہی کہ آپ کی ہونے والی بیوی کو تو میں جانتا ہوں۔ بڑی سعید بچی ہے۔ آپ کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔ خدا کرے کہ آپ اس کے قابل ثابت ہوں۔ اس کے بعد وہ داستان در داستان ایسے رواں ہوئے کہ خاتمہ کلام کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ آخر میں پروفیسر حمید احمد خاں سے کہ محفل میں میرے عزیزوں میں وہی ایک بزرگ تھے اور خلیفہ صاحب کے چہیتے شاگرد بھی، عرض کیا کہ خلیفہ صاحب کو کسی طرح اشارہ کریں کہ وقت کم ہے اور موسم بہت سرد، ہم یہ تقریب جلد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ حمید احمد خاں صاحب نے کسی قدر شرارت آمیز لہجے میں بہ آواز بلند کہا کہ

خلیفہ صاحب قبلہ آپ کے علم و فضل کے خزانے تو لامتناہی ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے، اس پر مجلس میں قہقہہ پڑا، مگر اس فقرے کا سب سے زیادہ لطف خود خلیفہ صاحب نے لیا۔ اس لیے کہ یہ فقرہ تھا ہی ان کا۔ بعد میں انہوں نے خود بتایا کہ مجید ملک صاحب اور آمنہ باجی کے نکاح کے موقع پر جب خلیفہ صاحب ہی کے ایک دوست مولانا صدر الدین صاحب اس قسم کا طویل خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو خلیفہ صاحب نے دلہن کے ماموں کی حیثیت سے انہیں اس طرح مخاطب کیا تھا۔ حمید احمد خاں صاحب نے خلیفہ صاحب سے یہ قصہ سن رکھا تھا۔

اس واقعے کے کوئی ایک مہینے بعد یعنی جنوری ۱۹۵۹ء کے آخر میں خلیفہ صاحب کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ میں اتفاق سے کراچی کے سرکاری دورے پر تھا۔ خلیفہ صاحب بھی کسی کام کے سلسلے میں وہاں پہنچے۔ وفات سے ایک دن پہلے خلیفہ صاحب مجید ملک کے ہاں آئے اور ہم سب نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا، دوسرے دن صبح خلیفہ صاحب، ممتاز حسن صاحب سیکرٹری فنانس حکومت پاکستان سے ملنے گئے، ممتاز صاحب کسی ضروری کام میں مصروف تھے۔ خلیفہ صاحب صوفے پر بیٹھے ہوئے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کررہے تھے کہ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور انہوں نے ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔

خلیفہ صاحب پہلے بھی ایک دفعہ دل کے دورے کا شکار ہوئے تھے مگر انہوں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ انہوں نے اپنے اس عارضے کے متعلق یہ رائے قائم کرلی تھی کہ دل کا زخم ایک دفعہ ٹھیک ہوجائے تو پھر وہ ٹھیک ہی رہتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے غذا اور دیگر معمولات میں بھی کبھی کوئی پرہیز ملحوظ نہیں رکھا۔ اپنے قینچی مارکہ سگریٹ بھی مستقل پیتے رہے، کبھی کسی قسم کی ورزش بھی نہیں کی بلکہ جب انہیں اس زمانے کے مشہور امریکی ماہر قلب پال ڈیڈلے وہائٹ کا یہ قول سنایا گیا کہ دل کے مریضوں کو پیدل چلنا چاہیے یا سائیکل چلانا چاہیے تو خلیفہ صاحب نے کہ پیدل چلنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ”اینا ں

ڈھکیاں دا کی پتہ اے، کدی کُج کہندے نیں کدی کُج۔'' اس پنجابی فقرے کے بنیادی لفظ ڈھکیاں کی اردو تو مجھے آتی نہیں باقی مطلب یہ ہے کہ ان کا کیا پتہ کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خلیفہ صاحب وسیع المشرب اور روشن خیال آدمی تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ایک طرف تو پطرس بخاری، مجید ملک، تاثیر، امتیاز علی تاج، جسٹس ایس اے رحمان جیسے حضرات شامل تھے ان کے علاوہ بھی ان کا ملنا جلا زیادہ تر اسی قسم کے انگریزی پڑھے لکھے مگر اردو فارسی سے ربط رکھنے والے جدید خیالات کے لوگوں سے تھا اور دوسری طرف ان کے ادارے میں روایتی دینی مدرسوں کے پڑھے ہوئے مولوی تھے جن سے ان کا روزانہ کا رابطہ تھا اور جن کی معلومات اور ریسرچ سے وہ استفادہ بھی کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب ان دونوں دنیاؤں کے شہری تھے اور دونوں میں آسودہ رہتے تھے۔ وہ سنجیدہ فکری مسائل سے اپنی گہری دلچسپی اور لگاؤ اور اپنے علم و فضل کے باجود خشک آدمی نہیں تھے۔ اپنی فطری شگفتہ مزاجی اور خوش دلی کے باعث وہ ہر محفل کے آدمی تھے اور کبھی کبھی تو وہ اپنے موچی دروازے کے یارانِ قدیم سے ملنے بھی چلے جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے ہم عمروں کے علاوہ چھوٹی عمر کے لوگوں اور نوجوانوں سے بھی انتہائی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں حکایتوں اور داستانوں کی چاشنی بھی تھی اور لطائف و ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی۔ میں نے انہیں کبھی کسی قسم کے شکوک و شبہات میں گرفتار نہیں دیکھا۔ دراصل وہ اپنے آپ میں اور اپنے آپ سے بہت مطمئن اور خوش تھے اور دوسروں کو بھی اسی طرح مطمئن اور خوش دیکھنا چاہتے تھے۔

(۱۹۹۵ء)